وبائی امراض اور
جمعہ و جماعت پر پابندی
دلائل اور اصولی تجزیہ

تالیف ڈاکٹر محمد مشتاق احمد
ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

حارث پبلی کیشنز

وبائی امراض
اور
جمعہ و جماعت پر پابندی

دلائل اور اصولی تجزیہ

تالیف:

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

پیشِ گفتار

حال ہی میں چین سے جنم لینے والی وبا ''کورونا وائرس'' نے اس وقت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک اس وبا سے نپٹنے میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں کافی کچھ احتیاطی تدابیر اور اقدامات بروئے کار لائے جارہے ہیں۔ عام لوگوں کو اس وبا کی سنگینی کا اندازہ اس وقت تک نہ ہوا تھا جب تک یہ چین میں ہی مقید تھی، البتہ جیسے ہی چین سے اس وبا نے مسافر حضرات کی صورت میں اپنے قدم باہر نکالے، پوری دنیا میں خوف و ہراس کی فضا قائم ہوگئی جو تا حال برقرار ہے۔ چین کے بعد ابھی تک جو ملک اس وبا سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ اٹلی ہے اور اس کے بعد دیگر یورپی ممالک، امریکہ اور ایران وغیرہ۔ جہاں ہزاروں افراد اس وبا سے متاثر ہو چکے ہیں اور کئی موت سے ہمکنار بھی۔ چونکہ پاکستان سے ایک کثیر تعداد میں زائرین ایران آتے جاتے ہیں، چنانچہ ایران میں اس وبا کے شدت سے پھیلنے کے سبب بعض ایرانی زائرین کے ذریعے اس کا پاکستان میں بھی ورود ہوگیا ہے۔ پاکستان میں اس وبا کے آنے کے ساتھ ہی حکومت نے مختلف قسم کے اجتماعات پر پابندی لگا دی کیونکہ یہ وبا ایک متعدی مرض ہے جو کہ بذریعہ سانس، ہوا، چھینک، تھوک اور چھونے سے پھیلتا ہے۔ ایسے میں اجتماعات اس وبا کے پھیلنے کا سب سے موثر ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جب اجتماعات پر پابندی کی بات چلی تو حکومتِ پاکستان کی طرف سے جمعہ اور باجماعت صلوٰۃ پر بھی روک لگانے کی بات کی گئی۔ پاکستان سے قبل متحدہ عرب امارات، سعودی عربیہ، کویت، قطر اور عمان وغیرہ میں باجماعت صلوٰۃ اور جمعہ پر پابندی لگا دی گئی ہے اور لوگوں کو گھروں پر صلوٰۃ ادا کرنے

کے سرکاری احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔

پاکستانی حکومت کی طرف سے جب ایسے اقدامات کی بات ہوئی تو ہمارے ہاں کے علمائے کرام اس سلسلے میں مختلف الرائے نظر آئے۔ بعض علماء اس متعلق خلیجی علماء کے موقف کے موئید ہیں کہ وبا کی صورتحال میں باجماعت نماز اور جمعہ پر پابندی لگانا ہی صائب اجتہاد ہے جبکہ اکثریت اس رائے سے متفق نہیں۔ جو علمائے کرام اس رائے سے متفق نہیں، ان کے موقف کی نہایت عمدہ نمایندگی ڈائریکٹر جنرل ،شریعہ اکیڈمی ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب نے اپنے ایک مضمون کے ذریعے کی جو فیس بک پر آٹھ اقساط میں شائع ہوا۔ یہ مضمون اپنے اندر نہایت وقیع مباحث رکھتا ہے سو اسی سبب ہم نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب سے اجازت لے کر اس مضمون کو ایک جگہ یکجا کر کتابی شکل میں اس کا پی ڈی ایف بنوا کر عام قارئین کے لئے اپلوڈ کر دیا جائے۔ سو اسی سلسلے میں زیرِ نظر پی ڈی ایف آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ چونکہ اس رسالے کے متن میں قارئین تفصیل سے ان علماء کا موقف ملاحظہ کریں گے جو کہ کورونا کے سبب باجماعت صلوٰۃ اور جمعہ پر پابندی کے فیصلے کے حق میں نہیں ہیں، چنانچہ ہم نے سوچا کہ تصویر کا دوسرا رخ سامنے رکھنے کی غرض سے ان علماء کا موقف بھی مختصراً ہدیۂ قارئین کر دیا جائے جو کہ اس متعلق پابندی کے جواز کے قائل ہیں۔ جواز کے قائلین کا مقدمہ سب سے عمدہ انداز میں جناب طاہر اسلام عسکری صاحب نے فیس بک پر نشر کردہ اپنی ایک تحریر میں پیش کیا تھا۔ قارئین کے استفادے کے لئے ہم اس تحریر کو من وعن یہاں نقل کر رہے ہیں:

جماعت کی معطلی/محدودیت پر اعتراضات کا جائزہ

کورونا وائرس کی ہلاکت خیزیوں سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر میں سعودیہ، متحدہ عرب امارات اور الجزائر سمیت بعض مسلم ممالک نے مساجد میں نماز پنجگانہ کی جماعت اور جمعہ کے اجتماعات کی ممانعت کر دی ہے کیوں کہ ایک مقام پر زیادہ لوگوں کے اکٹھا ہونے سے اس وائرس کے پھیلاؤ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اس موقف کے دلائل بڑے مضبوط اور مقاصد شریعت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، اس لیے قابل ترجیح رائے یہی ہے لیکن بہ ہر حال یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ چناں چہ پاکستان کے زیادہ تر علما ایسی کسی پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔ اہل حدیث کے بعض جلیل القدر اہل علم اور بریلوی مکتب فکر کے ممتاز عالم مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے جمعہ اور جماعت کے لیے مساجد کو بند کرنے کے موقف کو مسترد کر دیا ہے۔ ان حضرات کا استدلال درج ذیل نکات پر مبنی ہے:

١۔ تاریخ میں اس سے پہلے بڑے بڑے طاعون اور وبائیں آئیں لیکن مساجد کو بند نہیں کیا گیا۔

٢۔ مفتی منیب صاحب نے نمازِ خوف کی مثال دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مڈبھیڑ میں بھی جماعت سے رخصت نہیں دی گئی تو کورونا کی وجہ سے کیسے دی جا سکتی ہے؟

٣۔ مریضوں کو تو منع کیا جا سکتا ہے لیکن تندرست افراد کے لیے مساجد کی بندش ظلم اور حرام ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ①

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟"

اس ضمن میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:

۱۔ تدبیری امور کے متعلق کسی رائے کا تاریخ میں موجود نہ ہونا شرعاً اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ماضی میں جو وبائیں پھوٹیں، اگر ان کے سد باب کے لیے مساجد کی بندش کا فیصلہ نہیں کیا گیا تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ایسا فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا، خصوصاً جب شریعت میں کسی سبب کی بنا پر مساجد میں عدم حاضری کی رخصت موجود ہو، جیسا کہ بارش کے دوران میں یہ اعلان کرایا جاتا تھا کہ نماز گھروں میں پڑھ لی جائے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے مساجد میں نہ آنے کی رخصت موجود ہے بل کہ خود شارع علیہ السلام نے اس کی ترغیب دی ہے۔ اس سے مساجد میں نہ آنے کا شرعی جواز نکلتا ہے، نیز: وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ سابقہ اہل علم اور مجتہدین نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا یا ان کے گمان کے مطابق مساجد میں حاضری سے اس کے پھیلاؤ کا خطرہ نہیں ہوگا۔ یوں بھی طاعون وغیرہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں جب کہ کورونا کا معاملہ یک سر مختلف ہے کہ اس کی ظاہری علامات بہت زیادہ واضح اور نمایاں نہیں ہیں اور نہ ہی جلد ظاہر ہوتی ہیں، اس لیے احتیاط ہی اصل حل ہے۔ مزید برآں ان زمانوں میں طاعون سے لاکھوں لوگ ایک ہی علاقے میں ہلاک ہوتے رہے ہیں جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ڈھائی لاکھ لوگ لقمہ اجل بن

---

①سورۃ البقرہ: ۱۱۴۔

گئے تھے؛ تو کیا ضروری ہے کہ اب بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی جانیں داؤ پر لگائی جائیں؟

۳۔ تاریخی مطالعے سے ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ وبا کی وجہ سے اتنی اموات ہوئیں کہ مساجد میں آنے والے ہی نہ رہے اور وہ بند ہو گئیں۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

448ھ میں مصر اور اندلس میں ایسا قحط اور وبا پھیلی، جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی؛ حالت یہ ہوگئی کہ مساجد بند پڑی تھیں اور کوئی نماز پڑھنے والا نہ تھا؛ اس کا نام جوع الکبیر کا سال رکھا گیا۔ [**في عام 448 هـ: وقع في مصر والأندلس قحطٌ ووباءٌ كبير، لم يُعهد قبله مثله، حتى بقيت المساجد مغلقة بلا مصلٍّ، وسُمي: عام الجوع الكبير**] ①

۴۔ جہاں تک نماز خوف کی مثال ہے تو اس میں بھی سبھی کو ایک ہی وقت میں نماز باجماعت پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دو گروپ بنا کر ایک کو نماز پڑھنے اور دوسرے کو لڑائی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن اگر اجتماع بجائے خود ہی خطرے کا باعث ہو تو اس سے استدلال صحیح نہیں بنتا کیوں کہ علت مختلف ہے۔ وہاں علت دشمن کا خوف ہے جسے ایک گروہ روک سکتا ہے؛ یہاں وائرس پھیلنے کا اندیشہ ہے جو لوگوں کے جمع ہونے سے پھیلتا ہے؛ اس لیے اس سے بچنے کے لیے بڑے اکٹھ سے گریز لازم ہے۔

۵۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ تندرست کو مسجد سے روکنا حرام ہے، البتہ مریض یا متوقع مریض کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں مشکل ہی یہ ہے کہ مریض اور صحت مند میں فرق و امتیاز دشوار ہے کیوں کہ پہلے مرحلے پر مریض کا پتا

---

① سير أعلام النبلاء 311/18

ہی نہیں چلتا جب کہ وائرس موجود ہوتا ہے جو دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بنا بریں سبھی کو احتیاطاً ایک دوسرے سے فاصلے ہی پر رہنا چاہیے جو کہ باجماعت نماز کی صورت میں ممکن نہیں؛ اِلَّا یہ کہ بہت تھوڑے لوگ ہوں اور وہ بھی فاصلے پر کھڑے ہوں۔ مزید برآں احتیاطی تدبیر کے طور پر لوگوں کو اجتماع سے روکنا اس آیت کے زمرے میں نہیں آتا کہ مساجد میں روکنے والے ظالم ہیں کیوں کہ یہاں ایک عذر موجود ہے یعنی انسانی جان کی حفاظت کا اہتمام؛ جب کہ قابل مذمت عمل یہ ہے کہ لوگوں کو بلا وجہ صرف اللہ کی عبادت سے روکنے کے لیے مساجد کے دروازے ان پر بند کر دیے جائیں۔

٦۔ عرب ممالک میں اگرچہ کلی طور پر مساجد بند کر دی گئی ہیں، تاہم یہاں یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ محدود پیمانے پر جمعہ اور جماعت کا سلسلہ جاری رکھا جائے؛ یعنی مساجد کا انتظامی عملہ باجماعت نماز اور خطبہ جمعہ میں شریک رہے تاکہ شعائر کی کامل معطلی کی صورت بھی پیدا نہ ہو اور احتیاطی تدبیر پر بھی عمل ہو جائے۔ عامۃ الناس مگر گھروں پر ہی جماعت کا اہتمام کر لیں اور جمعے کے بجائے ظہر پر اکتفا کریں۔ **ھذا ما عندی و العلم عند اللہ**

واضح رہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی نوعیت کا ہے جس میں اختلاف رائے کی گنجایش موجود ہے، اس واسطے دوسری رائے رکھنے والے پر طعن و تشنیع یا بدتہذیبی روا نہیں۔ علمی مکالمے اور نقد و نظر کا سلسلہ اگرچہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔[١]

اسی طرح فضیلۃ الشیخ حافظ ابو یحییٰ نور پوری حفظہ اللہ بھی اس سلسلے میں پابندی کے جواز کے قائل ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنی فیس بک پوسٹ

---

① محترم طاہر اسلام عسکری فیس بک پوسٹ مورخہ ۱۸ مارچ ۲۰۲۰ء۔

مورخہ ۲۳ مارچ ۲۰۲۰ء میں ان الفاظ میں کیا:

کرونا کی شدت اور گھر میں نماز

لوگ بار بار سوال کر رہے ہیں کہ ان حالات میں گھروں میں باجماعت نماز پڑھی جاسکتی ہے یا مسجد جانا فرض ہے؟ اگرچہ علماء کا اس میں اختلاف ہے، تمام علماء قابل احترام ہیں اور سب نے فتویٰ میں حق تک پہنچنے ہی کی کوشش کی ہے، لیکن موجودہ حالات میں بندہ ناچیز کو ان علماء کا فتوی دلیل کی رو سے وزنی محسوس ہو رہا ہے جو مسجد جانے کی فرضیت ساقط سمجھ کر گھر میں نماز باجماعت کی اجازت دے رہے ہیں۔

بہت سے ایسے لوگ آن دی ریکارڈ ہیں جو بظاہر صحت مند ہیں، لیکن ان کا کرونا ٹیسٹ پازیٹو ہے اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ ایسے لوگ دیگر بیمار یا بوڑھے لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ایک شخص نماز کے لیے مسجد چلا جائے، لیکن وہ یہی سوچتا رہے کہ ہوسکتا ہے، میرے ساتھ والے کو کرونا ہو، خصوصاً سجدے کے حالت میں زیادہ قرب ہوتا ہے، سجدے میں کسی کو چھینک آجائے تو ان حالات میں شاید ہی کوئی وسوسے سے بچ سکے۔

شریعت نماز سے توجہ بانٹنے والی کسی بھی صورت کو قبول نہیں کرتی، جیسا کہ بھوک توجہ بانٹ سکتی ہو تو پہلے بھوک مٹانے کا حکم ہے۔

کرونا وائرس کا معاملہ تو اس سے بھی بہت زیادہ سنگین ہے، پوری دنیا کے لیے زندگی موت کا معاملہ بنا ہوا ہے، ان حالات میں کسی نارمل شخص کی چھینک بھی یقیناً ساتھ والے بہت سے نمازیوں کی توجہ ختم کردے گی۔

بعض فیس بک پوسٹیں دیکھی ہیں کہ ہسپتال کھلے ہیں، مسجدیں بھی شفا خانے ہیں، انہیں بھی کھلا رہنا چاہیے......تو عرض ہے کہ پھر کرونا کے مریضوں کو تو بالاولی مسجدوں میں آنا چاہیے، آپ کیوں روکتے ہیں؟ ایسی کوئی دلیل شرعی نہیں کہ مسجد میں وائرس منتقلی کا عمل رک جاتا ہے۔

بہتر یہی ہے کہ بارش کے موسم کی طرح مسجدوں میں اذان کے ساتھ یہ صدا دے دی جائے کہ اپنے اپنے گھروں میں نمازیں پڑھو، یہ تو بارش سے بے شمار گنا زیادہ خطرناک مسئلہ ہے۔

هذا ما عندي، والله اعلم بالصواب ①

محترم طاہر اسلام عسکری اور حافظ ابو یحییٰ نورپوری ﷾ کے ان مختصر مضمون سے قارئین کو بہت کچھ ان نکات سے آگاہی حاصل ہوگئی ہوگی جو کہ پابندی کے جواز کی تائید کرتے ہوئے ان علمائے کرام کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ بات حاشیۂ خیال میں رہے کہ پابندی کے جواز کے قائل اور اس پابندی کو درست نہ سمجھنے والے دونوں ہی اہل علم قابلِ احترام ہیں اور ان کے مابین یہ اختلاف محض اجتہادی نوعیت کا ہے۔ اس اختلاف کی سب سے عمدہ توضیح مشہور اہلحدیث عالم مولانا ضیاء اللہ برنی روپڑی ﷾ شیخ الحدیث جامعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ لاہور نے اپنے ایک قسط وار مضمون کے ابتدائیہ میں ان الفاظ میں کی ہے:

"موجودہ حالات میں جبکہ پوری امت مسلمہ کورونا وائرس کی تباہ کاریوں کی وجہ سے شدید مضطرب ہے اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے تحقیقی نتائج کے تناظر میں معالجین کا اس وائرس کے بارے میں طبی فہم بھی ناقص ہے، ایسی صورت حال میں اس نوزائیدہ مرض کے متعلق علمائے دین کی آراء کا تقسیم ہوجانا کوئی عجیب بات نہیں اور نہ

① حافظ ابو یحییٰ نورپوری، فیس بک پوسٹ مورخہ ۲۳ مارچ ۲۰۲۰ء

ہی یہ مضر ہے کہ ایک طبقہ علماء دلائل کی بنیاد پر دوسرے حلقہ علم کو مخطئ سمجھتا ہو، کیونکہ اس کی اصل تو خود حدیث مبارک نے بیان کر دی ہے: **إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران، وإذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر**

یعنی جب کوئی فیصلہ کرنے والا پوری محنت سے فیصلہ کرے اور درستی کو پالے تو اسے دہرا اجر ملتا ہے اور اگر پوری کوشش سے فیصلہ کرنے کے بعد غلطی کا شکار ہو جائے تب بھی اسے ایک اجر ملتا ہے۔

گذشتہ دنوں اس امر میں موقر لجنہ علمائے سعودیہ اور موقر طبقہ علمائے اہلحدیث کا فقہی اختلاف سامنے آیا جس میں روحانی و مادی اسبابِ تحفظ یا تعبدی و انسانی مصالح کی ترجیحات کا فرق یوں نظر آیا کہ انسانی جان کے تحفظ کے لیے سعودی لجنہ علماء نے مطلقا اغلاقِ مساجد کا فتوی صادر فرمایا، جبکہ پاکستانی علمائے اہلحدیث نے تمام تر حفاظتی تدابیر کو اختیار کرتے ہوئے مساجد اللہ کو آباد رکھنے کا فتوی صادر فرمایا۔

سعودی لجنہ کے نزدیک حفظِ نفس کی مصلحت عمارۃ المساجد اور اقامتِ شعائر اللہ مثل عمرہ وطواف وغیرہ کے مقابلے میں راجح قرار پائی، جبکہ ہمارے اہلحدیث علماء کے نزدیک مساجد میں اقامت شعائر اللہ کی مصلحت بایں وجہ راجح رہی کہ انکے نزدیک وہ حفظِ نفس اور مصیبت سے نجات کا بھی ایک قوی رُوحانی سبب ہے۔ نیت دونوں کی اچھی ہے اور دونوں ہی ان شاء اللہ عند اللہ ماجور ہیں۔ عرب و عجم میں دونوں ہی جگہ اپنے اپنے علماء سے مختلف موقف رکھنے والے

علماء بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ان علماء کی آراء کا علمی مناقشہ بھی باہمی احترام واُلفت کوملحوظ رکھتے ہوئے دونوں اطراف سے جاری رہا، اور یہ سب کچھ اسی جذبہ صادقہ کے تحت تھا جس کے ساتھ علمائے امت مشکل حالات ونوازل میں حکم شرعی کا استنباط کرتے ہوئے مُلک وملت کی راہنمائی کرتے ہیں، تاکہ دین ودُنیا کی فلاح حاصل ہوسکے۔" ①

یاد رہے کہ علامہ ضیاء اللہ برنی روپڑی ﷾ کا تعلق ان علماء میں سے جو اس پابندی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ اور یہی کچھ موقف اس رسالے کے مولف ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب کا بھی ہے۔

کورونا سے متعلق کچھ وضاحتیں

ہر بیماری اللہ کے اذن سے ہی نقصان پہنچاتی ہے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے احتیاط وعلاج کا درس دیا ہے اور بیماری وناگہانی آفات سے اللہ کی پناہ مانگنے کی دعائیں بتائی ہیں۔ اسی طرح بیماریوں کے متعدی ہونے کے سبب آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ

''جزامی سے ایسے بھاگو جیسے تم شیر کو دیکھ کر بھاگتے ہو''۔

علمائے اسلام نے اس روایت کی دیگر متعارض روایات کے ضمن میں کئی توجیہات کی ہیں البتہ فی زمانہ میڈیکل سائنس کی ترقی نے اس روایت کے ظاہری مفہوم کو کافی تقویت پہنچادی ہے۔ سو کورونا سے متعلق سب سے مناسب

---

① اعلامیہ علمائے اہل حدیث۔ ازالہ شبہات اور اہلِ علم کی ذمے داری۔ قسط اول۔

طرز عمل یہی ہے کہ اس سلسلے میں تمام احتیاطی تدابیر بروئے کار لائی جائیں تاکہ بحیثیت قوم ہم اس بیماری کے پھیلنے کی شرح کو روک سکیں۔

یقیناً ابھی تک کی موجودہ رپورٹس وریسرچ اور سروے کے مطابق اس بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد فلو سے ہلاک ہونے والوں سے قدرے کم ہے لیکن عام فلو اور اس بیماری میں ایک نمایاں فرق ہے اور وہ یہ کہ عام فلو سے متعلق طبی ماہرین تحقیق مکمل کر کے اس کے تمام اثرات ونتائج جان چکے ہیں اور اس کے تدارک کے لئے ویکسین بھی دریافت کر چکے ہیں۔ جبکہ کورونا اس معاملے میں عام فلو سے مختلف ہے کہ فی الحال اس بیماری سے متعلق طبی ماہرین کی تحقیق مکمل نہیں ہوسکی اور نہ ہی وہ اس کے تمام ممکنہ اثرات ونتائج سے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ابھی تک اس کی کوئی Verified یعنی تصدیق شدہ ویکسین اناونس اور دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ پھر عام فلو جس تیزی سے پھیلتا ہے، کورونا کے پھیلنے کی شرح اس سے کہیں زیادہ ہے جس سبب یہ عوام میں اس بیماری کو لے کر زیادہ خوف و ہراس کا باعث بنتا ہے۔ گھر میں ایک آدمی بیمار ہو تو باقی مل کر اسکی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دے لیتے ہیں لیکن اگر گھر کے سارے افراد ہی ایک ساتھ بیمار پڑ جائیں تو پھر گھر کا نظام کسی ایک کی مکمل صحت یابی تک دھرم بھرم ہو جاتا ہے۔ سو اس سبب مناسب یہی ہے کہ کورونا سے متعلق ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے تجویز کردہ اقدامات پر سختی سے عمل پیرا رہا جائے تاکہ اس بیماری کو اس ممکنہ وقت تک پھیلنے سے روکا جا سکے جب تک کہ اس کی کوئی تصدیق شدہ ویکسین تیار نہیں کر لی جاتی۔

دنیا میں ادویات اور دیگر اضطراری چیزوں کی پیداوار کا تناسب ہمیشہ آبادی سے کم رکھا جاتا ہے کیونکہ ادویات وغیرہ ہر آدمی کو ہر دن نہیں چاہیے

ہوتی ۔ اسی سبب ان کی پیداوار کا تناسب عام اشیائے خورد ونوش کے مقابلے میں کم ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہوئی کہ کورونا کے پھیلنے کی خبر کے ساتھ ہی پاکستان سمیت تقریباً دنیا کے ہر ملک میں فیس ماسک face mask اور جراثیم کش محلول sanitizer کی قیمتیں بڑھ گئیں کیونکہ یکدم لوگوں کی تعداد کے مقابلے میں ان اشیاء کی مانگ میں قدرے اضافہ ہوگیا ہے ۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جس میں اشیائے خورد ونوش کے علاوہ اور کئی ضروری چیزوں کی عموماً کمی رہتی ہے ۔کل کلاں کو اگر ہماری بے احتیاطی کے سبب پاکستان میں یہ بیماری اسی شرح سے پھیلنا شروع ہوجاتی ہے جس شرح سے چین اور اٹلی میں پھیلی ہے تو یقین جانئے اس معاملے سے متعلق عوام کی جہالت اور بے احتیاطی کے سبب پاکستان میں کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کے اس بیماری سے متاثر ہونے کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں اور ایسے میں ادویات کی کمی اور جدید طبی سہولیات نہ ہونے کے سبب یہ بیماری نہایت تیزی سے عام فلو کے مقابلے میں پاکستان میں ایک عفریت کی شکل اختیار کرسکتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھرپور توکّل رکھتے ہوئے ڈاکٹروں کی بتائی گئی تمام احتیاطی تدابیر جیسے باقاعدگی سے صابن سے ہاتھ دھونا، غیر ضروری میل جول اور اختلاط سے اجتناب برتنا، اس مرض کے مریضوں سے دوری بنائے رکھنا وغیرہ پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دد (۲) مسنون دعاؤں کو اپنا روز کا معمول بنا لیجئے ۔ ان دونوں دعاؤں کو کوشش کرکے ترجمہ کے ساتھ دل کی گہرائی سے اللہ کے حضور پڑھیے ۔ جن حضرات کو یہ دعائیں یاد ہیں وہ چاہے تو صلوٰۃ کے اندر تشہد میں سلام پھیرنے سے قبل بھی ان کو پڑھ سکتے ہیں ۔ وہ دعائیں یہ ہیں :

بِسْمِ اللهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ترجمہ: اللہ کے نام سے میں پناہ حاصل کرتا ہوں جس کے نام سے کوئی بھی چیز آسمان یا زمین میں تکلیف نہیں پہنچاتی اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مذکورہ بالا دعا جب بھی پڑھیں تین دفعہ پڑھیے۔

اللّٰھمّ إنِي أعوذُبِكَ منَ البرصِ والجنونِ والجذامِ ومن سيِّئِ الأسقامِ

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں برص، دیوانگی، کوڑھ اور تمام بری بیماریوں سے۔

ساتھ ہی کوشش کیجیے کہ اپنے روز مرّہ کے کھانے میں کلونجی اور شہد کو شامل کر لیجئے کہ نبی ﷺ نے ان دونوں چیزوں میں شفا بتائی ہے۔ تاہم مقولہ ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے سو اس سلسلے میں سب سے ترجیحی بات اسباب و احتیاطی تدبیر اختیار کرنا ہے۔ اس کے بعد ان مسنون دعاؤں اور غذا سے ان احتیاطی تدابیر کے ذریعے خاطر خواہ نتائج یعنی کورونا وائرس سے محفوظ رہنے کو یقینی بنانے کی کوشش کیجئے۔ اس سلسلے میں سب سے مناسب طرزِ عمل یہی ہے کہ عوام اس بیماری کے پھیلاؤ سے متعلق طبّی ماہرین کی بتائی گئی تمام احتیاطی تدابیر بروئے کار لائیں۔ خود آپ ﷺ نے بیماریوں کے لئے اللہ سے پناہ طلب کی ہے اور یاد رکھئے کہ نبی ﷺ کی ہر دعا کے پیچھے ان کے ٹھوس اعمال ہوتے تھے۔ آپ ﷺ جب عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے تو اپنے نیک اعمال سے اس دعا میں تقویت پیدا کرتے تھے، قرض سے پناہ مانگتے تھے تو ساتھ یہ کوشش کرتے تھے کہ کسی سے قرض لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔ سو یہی معاملہ متعدی بیماریوں کا بھی ہے۔ ان سے بچاؤ کے لئے ضرور بالضرور دعاؤں اور اذکار کا اہتمام کیجیے لیکن ان دعاؤں اور اذکار کو اپنے ٹھوس عمل سے تقویت پہنچایئے۔ جیسے حدیث قدسی

میں توکل سے متعلق آتا ہے کہ پہلے اپنے اونٹ کو کھونٹے سے باندھو، پھر مجھ پر توکل کرو کہ وہ رسی تڑوا کر نہ بھاگ جائے اوکما قال۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بھی اپنی حیات میں ایسے مریضوں سے ہاتھ نہیں ملایا جن میں کسی متعدی مرض کی علامت کا امکان موجود تھا۔ صحیح مسلم میں امام مسلم بنوثقیف کے ایک وفد کا ذکر کرتے ہوئے روایت لائے ہیں:

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَحْيَى، أَخْبَرَنَا هُشَيْمٌ، ح وَحَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا شَرِيكُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، وَهُشَيْمُ بْنُ بَشِيرٍ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: كَانَ فِي وَفْدِ ثَقِيفٍ رَجُلٌ مَجْذُومٌ، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّا قَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ

عمرو بن شرید نے اپنے والد سے روایت کی، کہا: ثقیف کے وفد میں کوڑھ کا ایک مریض بھی تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کو پیغام بھیجا: ہم نے (بالواسطہ) تمھاری بیعت لے لی ہے، اس لیے تم (اپنے گھر) لوٹ جاؤ۔

سو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کورونا کے پھیلنے کے سدباب کے لئے باہمی اختلاط سے از حد گریز کیا جائے۔ فی الحال لوگوں سے ہاتھ ملانے سے خود کو روکیں اور ساتھ ہی کسی بھی قسم کے اجتماعات منعقد کرنے سے پرہیز کریں، اپنے آس پاس صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ اگر آپ کو فلو یا کوئی بھی ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں تو فی الفوز قریبی طبی مرکز سے رابطہ کر کے اپنی مکمل تشخیص کروایئے تاکہ خدانخواستہ اگر آپ اس بیماری کا شکار ہو چکے ہوں تو بقیہ لوگوں کو اس سے محفوظ رکھا جا سکے۔

اس وضاحت کے ساتھ اب آگے قارئین ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب کا وہ مضمون ملاحظہ فرمائیں جس کا ذکر پیشِ گفتار کے ابتدائیہ میں کیا گیا تھا۔ اس سلسلے

میں ہم ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب کے نہایت شکرگزار ہیں کہ ہم نے جب ان سے اس مضمون کی پی ڈی ایف کی شکل میں اشاعت کی بات کی تو انہوں نے نہ صرف بخوشی اس کی اجازت دے دی بلکہ ہمیں اس مضمون کی ورڈ فائل بھی ارسال کردی تاکہ فیس بک سے مضمون نقل کرنے کی دِقّت سے بچا جاسکے۔

اس رسالے کی طباعت کے سلسلے میں سب سے پہلے تو اس اللہ عزوجل کے حضور شکرگزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کرسکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہوسکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالک کُل کے شکریہ کے بعد ہم ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس مضمون کی اشاعت کی اجازت دی۔ اللہ اس کے لئے ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔ ساتھ ہی ہم اپنے نہایت فاضل، محترم اور محبت کرنے والے دوست جناب حافظ عمران حفظہ اللہ کے بھی نہایت شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مصروف اوقات میں سے اس رسالے کے لئے وقت نکالا اور کتابت کی ذمہ داری کو بخوبی احسن انداز سے انجام دیا۔ اللہ اس تھکا دینے والے کام کے لئے ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ یہ احقر ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا کہ جب بھی اس کو اُن سے کسی طور کی مدد وتعاون درکار رہوا، حافظ عمران صاحب ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ موجود رہے۔ اللہ ان کو دین ودنیا میں بہتیرا ترقیاں نصیب کرے اور ان کے لئے دونوں جہانوں میں آرام وسکون کا بندوبست کرے۔ اسی طرح اس رسالے کی اشاعت میں اور بھی چند احباب کی خصوصی مدد شاملِ حال رہی لیکن کیا کروں ان کی درویشانہ صفت کا کہ انہوں نے اپنے ناموں کا تذکرہ کرنے سے سختی سے منع کررکھا ہے، اسی لئے ان کا نام لئے بغیر ہی ان کی جناب میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی کوئی کمی نہ رہ جائے، اسی لئے بعض تسامحات کی حاشیوں اور مراجعات کے ذریعے تصحیح کرنے کی کوشش بھی کی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

۲۳ مارچ ۲۰۲۰ء

جمعہ اور باجماعت نمازوں پر پابندی: اصولی تجزیہ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد
ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد
(mushtaqahmad@iiu.edu.pk)

اس موضوع پر کئی اہلِ علم کی آرا دیکھیں۔ چند ایک کے استثنا کے ساتھ بالعموم روش یہ نظر آئی کہ جزئیات اور اکا دکا واقعات پر بحث ہورہی ہے لیکن اصولی مباحث کا تجزیہ نہیں کیا جارہا جبکہ مسئلے کو جڑ سے پکڑنے کے لیے اصولی مباحث ہی زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ آج ہمارے دوستوں کی مجلس میں ہم نے کوشش کی کہ اس طرح کے اصولی سوالات پر غور کرکے شریعت کا صحیح منشا معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مجلس میں ڈاکٹر زاہد مغل صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عثمان ظفر صاحب اور ڈاکٹر عطاء اللہ خان محمود وٹو نے شرکت کی۔

پہلا سوال:

باجماعت نماز کا شرعی حکم کیا ہے؟

ہمارے ہاں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ دوسرے سوال پر بحث چاہتے ہیں اور پہلے سوال کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ چنانچہ بحث شروع ہی یہاں سے کی جاتی ہے کہ حالات یوں ہیں یا ووں ہیں تو اب جماعت کیوں کی جائے؟ بھئی، پہلے یہ بات تو متعین کرلیں کہ باجماعت نماز کا شرعی حکم کیا ہے؟ اصلی حکم معلوم ہوجائے جو عام حالات کے لیے ہوتا ہے، تو اس کے بعد خاص حالات کے

حکم پر بھی غور کرلیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کیا وہ خاص حالات پیدا ہو گئے ہیں جن میں اصلی حکم کے بجائے اس کے متبادل کی طرف جانا ہوگا؟ فقہائے کرام اس کے لیے عزیمت اور رخصت کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔

اب جہاں تک عزیمت، یعنی اصلی حکم، کا تعلق ہے تو شرعاً اتنی بات طے ہے کہ مسلمانوں کے گروہ پر اجتماعی حیثیت سے لازم ہے کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام کرے۔ شرعی اصطلاح میں، کسی مخصوص علاقے میں رہنے والے مسلمانوں پر باجماعت نماز کا اہتمام فرضِ کفایہ ہے (چاہے فرد کے لیے اس میں شرکت سنت مؤکدہ ہو یا واجب)۔

فرضِ کفایہ سے مراد یہ ہے کہ کم از کم اتنے افراد اسے ادا کریں جتنے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ضروری ہیں، تو باقی افراد کے ذمے سے بھی، جنھوں نے وہ فریضہ ادا نہیں کیا، یہ فریضہ ساقط ہوجائے گا لیکن اگر اتنے افراد نے اسے ادا نہیں کیا تو سارے لوگ اس کے لیے گنہگار رہوں گے۔

شریعت نے باجماعت نماز کے فریضے پر کتنی تاکید کی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ حالتِ جنگ میں بھی جب دشمن کے حملے کا خدشہ ہو، جب تک ممکن ہو، مسلمان مجاہدین کو حکم ہے کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام کریں اور اگر عام طریقے سے ممکن نہ ہو تو یہ کریں کہ کچھ لوگ امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھیں اور کچھ اس وقت مورچوں پر جمے رہیں، پھر پہلی رکعت پوری ہونے پر یہ لوگ مورچوں پر جائیں اور وہ لوگ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پڑھیں؛ جبکہ دونوں گروہ ایک ایک رکعت الگ پڑھ لیں گے (پہلا گروہ دوسری رکعت، جبکہ دوسرا گروہ پہلی رکعت)۔

خوف کی حالت میں پڑھی جانے والی اس باجماعت نماز کی ہیئت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اصلی حکم میں کسی حد تک تخفیف ہوگئی ہے لیکن پھر بھی اصلی

حکم کسی حد تک باقی ہے:

چنانچہ یہ تخفیف تو کی گئی کہ نماز کی رکعتیں چار کے بجائے دو ہوں؛

یہ تخفیف بھی کی گئی کہ ایک گروہ مورچے پر رہے اور ایک امام کے پیچھے، پھر وہ جگہیں تبدیل کرلیں؛

لیکن باجماعت نماز کا حکم پھر بھی برقرار رہا۔

اس سے شریعت کا یہ اصول معلوم ہوا کہ حالات میں تبدیلی کی وجہ سے جب اصلی حکم پر اصلی شکل میں عمل ممکن نہ رہے تو اصلی حکم پر عمل جس حد تک ممکن ہو اس حد تک اس پر عمل کیا جائے گا، اور جس صورت یا جزو پر عمل ممکن نہ، اس میں رخصت مل جاتی ہے۔ پھر اگر خوف اس قدر شدید ہو، جیسے عین دشمن کے حملے کے وقت نماز کا وقت آجائے اور صفیں بھی نہ باندھی جاسکیں، باجماعت نماز سرے سے ممکن ہی نہ رہے، تب سواری کی حالت میں بھی اور پیدل بھی، جیسے ممکن ہو، نماز پڑھنے کا حکم ہے لیکن اس کسر کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے ذکر کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب مسلمانوں کے کسی مخصوص گروہ کے لیے باجماعت نماز سرے سے ممکن ہی نہیں رہی، تو اس کی فرضیت اس مخصوص گروہ سے ساقط ہوجاتی ہے لیکن اس کی کمی پوری کرنے کے لیے دوسرا حکم (اللہ کا ذکر) دیا گیا تاکہ حکم کی اصل روح باقی رہے۔

شریعت کا یہ مزاج اور اس کے احکام کی یہ ترتیب وضو، غسل اور تیمم کے احکام سے بھی معلوم ہوجاتی ہے۔ عام حالات کے لیے حکم وضو/غسل کا ہے۔ جب وضو/غسل ممکن نہ رہے، تو شریعت نے اس کے متبادل کے طور پر تیمم کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وضو/غسل سے جس طرح ظاہری تطہیر ہوجاتی ہے وہ تیمم سے نہیں ہوتی لیکن شریعت نے تیمم کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یاد رہے کہ نماز بغیر طہارت حاصل کیے نہیں پڑھی جاسکتی اور جب طہارت حاصل کرنے کے اصلی طریقے پر

عمل نہیں ہوسکتا تو اس کے قائم مقام کی حیثیت سے ایک اور طریقہ شریعت نے بتا دیا جو محض اس وجہ سے طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے کہ شریعت نے اسے یہی حیثیت دی ہے۔

پھر تیمم کے حکم سے ہی شریعت کا ایک اور اصول بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ جیسے ہی وضو/غسل ممکن ہوجائے تو تیمم سے حاصل شدہ طہارت ختم ہوجاتی ہے کیونکہ وہ تو محض قائم مقام کی حیثیت سے تھی۔ چنانچہ باجماعت نماز کے معاملے میں بھی جیسے ہی اصل حکم پر کلی یا جزوی عمل ممکن ہوجائے تو اصلی حکم کلی یا جزوی طور پر واپس لوٹ آئے گا۔

اب آیئے جمعہ کی نماز کے حکم کی طرف۔

جمعہ کی نماز کا قائم کرنا اس لحاظ سے باجماعت نماز کی طرح ہے کہ مسلمانوں کے گروہ پر اس کی اقامت ایک اجتماعی ذمہ داری ہے (چاہے فرد کے لیے وہ فرضِ عین ہو)۔ البتہ حنفی فقہائے کرام کے نزدیک بعض احکام میں یہ عام باجماعت نماز سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس کے لیے کچھ اضافی شرائط ہیں۔

مثلاً یہ ضروری ہے کہ جمعہ کی نماز مصر جامع میں پڑھی جائے، دیہات میں نہیں۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ حکمران خود یا اس کا نائب جمعہ کا خطبہ بھی دے اور نماز بھی پڑھائے۔

جب مسلمانوں کا دورِ زوال آیا تو ان میں سے بالخصوص دوسرے حکم پر عمل ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ وضو اور تیمم کی نظیر (اور اسی طرح دیگر کئی شرعی احکام کے نظائر) کو دیکھتے ہوئے فقہائے کرام نے قرار دیا کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ چاہے مسلمانوں کا حکمران باقی نہ رہے، جمعہ کی نماز پڑھی جاتی رہے کیونکہ اگر جمعہ کی نماز پڑھنی ہی ختم ہوجائے تو شریعت کا ایک بہت بڑا اور بہت اہم حکم ضائع ہوجائے گا۔ چنانچہ حکمران کی عدم موجودگی میں عالِمِ ثقہ کو اس کا قائم مقام مان کر

اس کی امامت میں جمعہ پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔

اسی طرح جب مسلمان تنہا یا چند افراد ایک مختصر ٹولے کی صورت میں کفار کے ہاں جاتے تو جمعہ کا حکم ان کے لیے نہیں تھا لیکن جب کفار کے غلبے کے دور میں ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مستقل مقیم رہی تو قائم مقامی اور اصلی حکم کی یاد باقی رکھنے کے اصولوں پر ہی وہاں جمعہ کا سلسلہ جاری رہا، باوجود اس کے کہ بیشتر فقہائے کرام نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے دیا تھا۔ بعد میں جب یورپ و امریکا میں بھی بڑی تعداد میں مسلمانوں نے اقامت اختیار کی تو دار الکفر میں مقیم ان مسلم اقلیتوں نے بھی اسی اصول پر جمعہ (اور عیدین) کا سلسلہ شروع کیا۔ (کوئی غامدی صاحب کے داماد کو یہ اصول سمجھائے تو امید ہے کہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔)

ممکنہ شروط پر عمل کے ساتھ بعض شروط کے بدل پر عمل، اور جن کا بدل بھی میسر نہ ہو تو وہاں ان کی عدم موجودگی کے باوجود حکم پر عمل، کا یہ سلسلہ شریعت کے اصلی حکم کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھنے کی کاوش کا ہی نتیجہ تھا۔ اس کی کئی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً رمضان و عیدین کا فیصلہ بھی اصلاً حکمِ حاکم پر ہی ہوتا تھا لیکن جن علاقوں میں کفار کے غلبے کے بعد مسلمانوں کا حاکم باقی ہی نہیں رہا (جیسے علامہ ابن الہمام اپنے دور کے قرطبہ کی مثال دیتے ہیں) تو وہاں عالمِ ثقہ کو مسلمان حکمران کا قائم مقام مان کر اس کے فتوی پر رمضان و عیدین کا فیصلہ کیا جاتا رہا۔ یوں نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعیت کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی بلکہ اجتماعیت سے متعلق شریعت کے حکم پر ممکن حد تک عمل بھی ہوتا رہا۔ (یہی صورت خلیفہ کے متعلق شروط کی بھی رہی جیسا کہ ایک دفعہ ہم امام غزالی کے حوالے سے تفصیل سے واضح کر چکے ہیں۔)

باجماعت نماز اور جمعہ کی نماز قائم کرنے کے متعلق فقہائے کرام اس

وجہ سے اتنے حساس تھے کہ یہ اسلام کے شعائر میں سے ہیں۔

دیکھیں، قرآن کریم نے مسلمانوں کے حکمران کی بنیادی ذمہ داریوں میں اولین ذمہ داری یہ ذکر کی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

(وہ لوگ جنھیں ہم زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں)

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے حکمرانوں کے فسق کے باوجود ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا بلکہ ان کے خلاف بغاوت سے روکا جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں۔

چنانچہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ باجماعت نماز اور جمعہ کی نماز جیسے شعائرِ اسلام کو اگر کوئی گروہ یکسر ترک کردے تو ان کے خلاف مسلمانوں کا حکمران جنگ لڑے۔ اس حکم کے لیے دیگر اصول اور نصوص کے علاوہ بالخصوص اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

(پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

اُمِرتُ ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ و اقاموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ۔

(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں۔)

ایسی کئی دیگر نصوص اور اصولوں کی روشنی میں شریعت کا منشا یہ ہے کہ

مسلمانوں کے حکمران باجماعت نماز قائم کریں اور جمعہ کا اہتمام کریں اور اگر کوئی گروہ باجماعت نماز یا جمعہ کو مجموعی طور پر چھوڑ دے تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرے۔ مسلمان حکمران کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ باجماعت نماز یا جمعہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالے۔ وہ ایسا کرے گا تو وہ حکمرانی کا جواز کھو بیٹھتا ہے۔ اگر باجماعت نماز یا جمعہ کی راہ میں کچھ مشکلات حائل ہیں تو مسلمان حکمران کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے اور حتی الامکان باجماعت نماز اور جمعہ کا سلسلہ اصلی صورت میں جاری رکھے ورنہ جہاں تک ممکن ہو متبادل عارضی بندوبست کرے۔ مسلمان حکمران کے لیے دستیاب جائز آپشنز میں باجماعت نماز یا جمعہ کا ترک کوئی آپشن نہیں ہے۔

یہ رہا پہلے سوال کا جواب۔

یہ جواب واضح ہو تو دوسرے سوال پر بحث آسان ہو جاتی ہے کہ جب باجماعت نماز یا جمعہ کی اقامت ممکن ہی نہ رہے، تو ایسی صورت میں مسلمان حکمران اور بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں سے شریعت کا مطالبہ کیا ہے؟

دوسرا سوال:

کیا کسی مجبوری کی حالت میں مسلمانوں کا حکمران باجماعت نماز یا جمعہ کا سلسلہ روک سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں پہلے یہ بات نوٹ کرلیں کہ جن لوگوں نے اس کے جواز کی بات کی ہے انھوں نے بالعموم فرد کی مجبوری کا عذر ذکر کیا ہے لیکن کوئی فرد کسی مجبوری کی حالت میں باجماعت نماز یا جمعہ ترک کرے، یہ الگ مسئلہ ہے اور کوئی حکمران کسی علاقے میں، یا پورے ملک میں، باجماعت نماز یا جمعہ موقوف کردے، یہ اس سے بالکل الگ مسئلہ ہے۔ دونوں مسئلوں کو ایک

دوسرے سے الگ الگ سمجھنا چاہیے۔

پہلے فرد کی جانب سے مسئلے کو دیکھیے:

یہاں پہلی بات یہ ہے کہ" مجبوری" سے استدلال کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ "اصلی حکم" یہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب بھی مجبوری کی حالت میں کسی کام کو جائز کہا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اصلاً یہ ناجائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجبوری اس حالت کو کہتے ہیں جب دستیاب تمام آپشنز میں کوئی بھی جائز آپشن باقی نہ بچے۔ اگر کوئی جائز آپشن باقی ہو تو وہی اختیار کرنا ہوگا اور ناجائز آپشن کے جواز کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (ساگ دستیاب ہو تو وہی کھانی ہوگی، سور کا گوشت نہیں، خواہ کسی کو ساگ کھانے سے کتنی ہی نفرت ہو۔)

تیسری بات یہ ہے کہ جس ناجائز کام کو مجبوری کی حالت میں جواز ملے وہ جواز صرف اس حالت تک ہی محدود ہوگا اور باقی رہنے کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ جیسے ہی مجبوری کی وہ حالت ختم ہو جائے گی تو اصلی حکم واپس لوٹ آئے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جس ناجائز کام کو وقتی طور پر جواز مل گیا ہے وہ جواز صرف مجبوری کی حد تک ہی رہے گا۔ Bare Minimum۔ اس سے زیادہ نہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں عارضی طور پر مجبوری کی حد تک جائز ہو جانے والا کام صرف اسی شخص کے لیے جائز ہوگا جو اس مجبوری میں گھرا ہوا ہو۔ کسی اور شخص کے لیے نہیں۔ دوسرے لوگوں کو اس کا جواز تب ملے گا جب وہ بھی اسی مجبوری کی سطح پر پہنچیں گے جس میں کسی شخص کے لیے عارضی طور پر کوئی ناجائز کام مجبوری کی حد تک جائز ہو جاتا ہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں ہر فرد اپنے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا کسی مخصوص حالت میں اس کے لیے باجماعت نماز یا جمعہ میں شرکت کا حکم باقی رہا یا نہیں؟

اب حکمران کی طرف آیئے۔

اگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا حکمران مسلمانوں کو باجماعت نماز یا جمعہ کی اقامت سے روک سکتا ہے، تو پہلے یہ بات یاد کیجیے کہ مسلمانوں کے حکمران کی اولین ذمہ داری اللہ کی شریعت پر خود عمل کرنا اور مسلمانوں کے لیے اس پر عمل میں سہولت پیدا کرنا ہے، نہ کہ اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا۔ (دستورِ پاکستان کی رو سے بھی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر زندگی بسر کرنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کرے۔)

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان حکمران کے کسی بھی حکم کے جواز کی دو بنیادی شرطیں ہیں:

ایک یہ کہ وہ شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو کیونکہ شریعت سے متصادم کسی حکم کا ماننا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے؛

دوسری یہ کہ وہ حکم "مصلحت" پر مبنی ہو۔

مصلحت سے مراد صرف یہی نہیں کہ وہ "مفادِ عامہ" کی خاطر دیا گیا ہو، بلکہ اس سے بھی پہلے، اور اصلاً، مراد یہ ہے کہ وہ حکم شریعت کے مقاصد کی حفاظت کے لیے دیا گیا ہو۔ (امام غزالی نے واضح کیا ہے شرعی اصطلاح میں "مصلحت" سے مراد نفع کا حصول یا ضرر کا دفع کرنا نہیں بلکہ شریعت کے مقصود کی حفاظت ہے۔)

چنانچہ اصل میں یہ سوال یوں بنتا ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے

جہاں مسلمانوں کا حکمران انھیں باجماعت نماز یا جمعہ سے روکے اور اس کا یہ حکم شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو بلکہ اس سے شریعت کے مقاصد کی حفاظت ہوتی ہو؟

حکمران کی جانب سے ایسے حکم کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کسی خاص فرد یا افراد کو جماعت یا جمعہ میں شرکت سے روکے۔ فقہاے کرام نے ایسی صورتیں ذکر کی ہیں (جیسے کسی جذام کے مریض کو جماعت میں شرکت سے روکا جائے)۔ یہاں وہ بیماری کے متعدی ہونے کے سوال پر بھی بحث کرتے ہیں کیونکہ بعض احادیث سے بظاہر کسی مرض کے متعدی ہونے کی نفی معلوم ہوتی ہے جبکہ بعض دیگر احادیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ ہم یہاں اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ اس پر مختلف اطراف سے کافی بحث پہلے ہی ہوچکی ہے۔ بہرحال فقہائے کرام اس صورت میں حکمران کے حکم کو ناجائز نہیں کہتے اور ہمارے سامنے زیرِ بحث صورت سے بھی یہ مختلف ہے کیونکہ یہ ایک فرد یا چند افراد کو کسی خاص عذر کی بنا پر جماعت یا جمعہ سے روکنے کا معاملہ ہے، جبکہ ہمارے سامنے زیر بحث سوال باجماعت نمازوں اور جمعہ کی عمومی ممانعت کا مسئلہ ہے۔

ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کسی خاص موقع پر کسی خاص مسجد میں جانے سے روکا جائے۔ یہاں پھر اگر اس کا کوئی جائز شرعی عذر ہو، جیسے مثال کے طور پر اس مسجد میں بارش، کیچڑ یا کسی اور سبب سے نماز قائم کرنا ممکن ہی نہ رہے یا بہت زیادہ حرج کا باعث بنے، یا وہ منہدم ہوگئی ہو اور اس کی تعمیرِ نو ہو رہی ہو۔ اور بھی امکانات سوچے جاسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواز پر بھی اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ تاہم یہ صورت بھی ہمارے سامنے زیر بحث مسئلے سے مختلف ہے۔

یہاں یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ حدیث مبارک میں جہاں "صلّوا فی رحالکم" یا اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے، وہ اسی نوعیت کا حکم تھا

کیونکہ شدید بارش کی وجہ سے مسجد میں آنا لوگوں کے لیے ممکن نہیں رہا، یا بہت زیادہ زحمت کا باعث بنا، تو انھیں کہا گیا کہ وہ گھروں میں نماز پڑھ لیں۔ مزید یہ کہ اس حدیث کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نہیں بلکہ اختیار دیا گیا تھا کہ چاہیں تو گھروں میں نماز پڑھ لیں۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اضافہ کرلیں کہ عہدِ رسالت میں نمازِ باجماعت کا اس قدر اہتمام کیا جاتا تھا کہ صرف شدید عذر رکھنے والا شخص یا پھر کوئی منافق ہی ہوتا تھا جو جماعت میں شریک نہ ہوتا۔ اس ماحول میں **صلّوا فی رحالکم** کا مطلب یہی بنتا ہے کہ جماعت میں شریک نہ ہونے والوں پر حرج نہیں ہے، ملامت نہیں ہے۔

ایک اور صورت جس کا فقہاے کرام ذکر کرتے ہیں، یہ ہے کہ اگر حکمران نے اپنے اجتہاد کی بنا پر، یعنی شریعت کے حکم پر بہتر طور پر عمل پیرا ہونے کی خاطر، کسی خاص شہر کی حیثیت ختم کر کے وہاں سے تمام انتظامی عملہ اور دفاتر کسی اور جگہ منتقل کر دیے تو اب اس سابق جگہ کی وہ حیثیت نہیں رہی جو" مصر جامع" کی ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہاں اب جمعہ کا حکم نہیں رہا بلکہ اب یہ حکم اس دوسری جگہ کے لیے ہو جائے گا۔ چونکہ یہ کام حکمران اجتہاد کی بنیاد پر، اور شریعت کے حکم پر بہتر طریقے سے عمل پیرا ہونے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اگر کسی اور کو اس کے اس اجتہاد سے اختلاف بھی ہو تو ایسے امور میں حکمران کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔

تاہم فقہائے کرام نے اسی جزیئے کے ضمن میں تصریح کی ہے کہ اگر حکمران کا یہ فیصلہ اجتہاد پر مبنی نہ ہو بلکہ بدنیتی کی بنیاد پر ہو (متعنتاً)، یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر ہو (اضراراً بھم) تو پھر مسلمانوں پر اس کے حکم کا ماننا لازم نہیں ہے اور تین بندے بھی اکٹھے ہو جائیں تو وہ جمعہ پڑھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ وہ صورت ہے جب حکمران صرف کسی خاص شہر میں جمعہ

روکے اور اس کے لیے باقاعدہ یہ بندوبست بھی کرے کہ اس کی بطورِ شہر حیثیت بھی ختم کر لے۔ پھر اس صورت میں کیا کہا جائے گا جب حکمران پورے ملک میں باجماعت نماز یا جمعہ پر پابندی لگائے؟

تاہم اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمران یہ حکم بدنیتی سے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر نہیں دے رہا، بلکہ مسلمانوں کو نقصان سے بچانے کی خاطر دے رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے، تو پھر ہمارے سامنے سوال کی نوعیت یہ بن جاتی ہے کہ کیا حکمران کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان سے بچانے کے لیے پورے ملک میں باجماعت نماز یا جمعہ پر پابندی لگائے؟ یا بہ الفاظِ دیگر، شریعت کے کسی مقصود کی حفاظت کے لیے وہ طریقہ اختیار کرے جو شریعت کے لیے اجنبی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر امام غزالی نے "مصلحتِ غریبہ" کے عنوان کے تحت گفتگو کی ہے۔

مصلحتِ غریبہ کے تصور کی وضاحت کے لیے امام غزالی نے بہت دلچسپ مثالیں دی ہیں۔

انسانی جان کا تحفظ شریعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ہے۔ اسی وجہ سے جان بچانے کے لیے مجبوری کی حالت میں، جب کوئی حلال آپشن دستیاب نہ ہو، جان بچانے کی حد تک مردار، یا کوئی اور حرام، کھانے کی رخصت مل جاتی ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ جب انسان کے پاس مردار، یا کوئی اور حرام، کھانے کا بھی آپشن نہ ہو، جیسے مثلاً وہ کسی غار میں پھنس گیا ہو، یا ملبے تلے دب گیا ہو، تو کیا وہ اپنی انگلی کھا کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتا ہے؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کُل کو بچانے کے لیے جزو کی قربانی دی جا سکتی ہے تو جان کو بچانے کے لیے انسان اپنی انگلی بھی کھا سکتا ہے؟

اس سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہوسکتی ہے کہ اگر پانچ بندے کسی غار میں پھنس جائیں، یا کسی کشتی میں بیچ سمندر میں گھر گئے ہوں، اور وہ اپنے میں سے ایک کو کھالیں، یا ایک کو کشتی سے باہر پھینک دیں، تو باقی چار بچ جائیں گے۔ (امام غزالی نے یہ مثالیں تقریباً 900 سال قبل دی ہیں۔ آپ سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال بعد ایک مشہور مغربی فلسفیِ قانون لون فلر نے The Case of the Speluncean Explorers کے نام سے ایک تفصیلی فرضی مقدمہ اسی مثال کو بنیاد بنا کر Harvard Law Review کے لیے پیش کیا اور پانچ مختلف جج صاحبان کی جانب سے پانچ مختلف فیصلے اس پر نقل کرکے بتانے کی کوشش کی ہے کہ حقائق کے ایک ہی مجموعے پر قانونی ضابطوں کے ایک ہی مجموعے کو منطبق کرتے ہوئے مختلف جج مختلف نتائج پر کیسے پہنچ سکتے ہیں، اگر ان کے اصول مختلف ہوں۔)

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک کو پھینک کر باقی چار کو نہ بچایا جائے؟ یا ایک کو بچانے کے چکر میں باقی چار بھی مر جائیں اور پھر یہ ایک بھی مر جائے؟ اور اگر کسی ایک کو مارنا ہی ہے، تاکہ باقی چار بچ جائیں، تو وہ ایک کون ہوگا؟ کیا اس کے لیے قرعہ اندازی کی جاسکتی ہے؟ یا باہمی رضامندی سے وہ پانچ کوئی اور طریقہ سوچ سکتے ہیں؟

ان سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مسئلے پر غور کریں کہ اگر کفار نے چند مسلمانوں کو ڈھال بنا کر ہم پر حملہ کیا اور ہمارے پاس ان کفار پر حملے کی، یا ان سے اپنے بچاؤ کی، سوائے اس کے کوئی راستہ نہ بچے کہ پہلے ہم ان ڈھال بنے ہوئے بے گناہ مسلمانوں کو ماریں اور اس کے بعد کفار پر حملہ کریں، تو کیا ہمارے لیے ان مسلمانوں کا قتلِ عمد جائز ہو جائے گا؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان چند کو مار کر ہم زیادہ مسلمانوں کو بچا پائیں گے؟ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر

کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم ان کو قتل نہیں کریں گے تو کفار ہم پر غالب آجائیں گے اور ہمیں مار کر پھر ان کو بھی قتل کرلیں گے تو جب بالآخر انھوں نے مرنا ہی ہے تو ابھی سے ہم ان کو مار کر باقی مسلمانوں کو کیوں نہ بچائیں؟

امام غزالی کہتے ہیں: بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ شریعت کے مقصود کی اس طرح حفاظت کہ اس سے شریعت ہی کے دوسرے احکام پامال ہوں، جائز نہیں ہے۔ وہ یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ یہ سارا استدلال تو محض ظن وتخمین پہ قائم ہے: وہ یہ کریں گے، تو پھر یہ ہوگا، تو پھر وہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ ایسا ہی ہو؟ (آخر God factor کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟)

وہ مزید پوچھتے ہیں کہ اگر ایسا ہو ہی جائے کہ کفار ہم پر غالب آجائیں اور ہمیں بھی مار کر پھر ان ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کو بھی قتل کرلیں، تب بھی دنیا سے تمام مسلمانوں کا (جی ہاں، وہ "تمام" مسلمانوں کا کہتے ہیں) خاتمہ تو نہیں ہوجائے گا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ جو لوگ "جان کی حفاظت" کو شریعت کا مقصود کہتے ہیں اور استدلال کی تفصیل میں کہتے ہیں کہ انسان نہیں ہوگا تو شریعت پر عمل کون کرے گا، وہ کتنی بڑی چھلانگ لگاتے ہیں!)

اس بحث کی روشنی میں اب اس سوال پر بحث آسان ہوگئی ہے جس پر ہم نے پچھلی قسط میں بحث روک دی تھی: کیا کوئی صورت ایسی ہوسکتی ہے جس میں شریعت کے مقصود کی حفاظت اس طریقے سے ہو جو شریعت کے لیے اجنبی ہے؟ اس صورتِ حال میں، جسے امام غزالی مصلحتِ غریبہ کا عنوان دیتے ہیں، تین شرائط پوری ہوں تو جواب اثبات میں ہوسکتا ہے:

ایک یہ کہ وہ مصلحت "ضروری" ہو؛ یعنی شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد ضروراتِ خمسہ، دین، نفس، عزت، عقل اور مال کی حفاظت کا انحصار اس پر

ہو؛
دوسری یہ کہ وہ مصلحت "قطعی" ہو؛ یعنی کسی اور احتمال کا امکان ہی نہ ہو اور شریعت کے اس مقصود کی حفاظت بس اسی طریقے سے ممکن ہو؛
تیسری یہ کہ وہ مصلحت "کلی" ہو؛ یعنی سب مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہو، بعض کا، یا اکثر کا، مسئلہ نہ ہو۔
ان شرائط کا پورا کرنا عملاً شاید ہی کبھی ممکن ہو سکے۔ (ہائیڈروجن بم کے حملے کے وقت شاید ممکن ہو۔)
اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ شریعت کے مقصود کی حفاظت کے لیے ہم پر لازم ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کریں جو شرعاً ناجائز نہ ہو۔
بحث اس موڑ تک پہنچ گئی ہے تو اب اس پہلو پر بھی بحث کر لیں جس پر کئی لوگوں نے بہت زور دیا ہے، یعنی انسانی جان کی حفاظت شریعت کا مقصود ہے۔ یوں عمومی انداز میں بات کی جائے گی تو کس کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے ؟ مسئلہ تو وہاں پیدا ہوتا ہے جب اس عمومی دعوے کی بنیاد پر شریعت کے خصوصی احکام کی معطلی کے لیے استدلال شروع کیا جاتا ہے۔ "شریعت کے مزاج"، "شریعت کی روح"، "شریعت کے مقصود" وغیرہ جیسی عبارات اور تراکیب مبہم ہیں اور موم کی ناک کی طرح کسی بھی طرف موڑی جا سکتی ہیں۔ اسی لیے فقہاے کرام نے واضح کیا کہ حکم معلوم کرنے کے لیے شریعت کی جزئیات ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ مثلاً جان کی حفاظت شریعت کا مقصود ہے لیکن دین کے لیے جان کی قربانی کو شریعت نے شہادت کا اعلی مرتبہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح دین کی حفاظت شریعت کا مقصود ہے لیکن جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کی اجازت خود شریعت نے ہی دی ہے، بشرطے کہ دل میں ایمان راسخ ہو۔ ہاں، کلمۂ کفر

سے گریز کیا جائے اور نتیجے میں جان چلی جائے تو یہ خودکشی نہیں ہے، جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے، بلکہ شہادت ہے جس کی شریعت نے ترغیب دی ہے۔

یہیں سے دو امور میں فرق پر بحث کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

ایک یہ کہ اضطرار کی حالت میں مردار، یا کسی اور حرام، کے سوا کوئی چیز نہ ہو جس سے جان بچائی جا سکے تو مردار، یا کوئی اور دستیاب حرام، کھا کر جان بچانا شریعت کی رو سے فرض ہے اور ایسی حالت میں مردار، یا کوئی اور دستیاب حرام، کھانا محض جائز نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اگر مضطر شخص نے مردار، یا کوئی اور دستیاب حرام، کھا کر جان نہیں بچائی تو وہ شرعاً گنہگار رہے اور خودکشی کا مرتکب قرار پائے گا۔ اس کے برعکس اکراہ یا اضطرار کے وقت جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہنے کی محض رخصت ہے، وجوب نہیں ہے اور اصلی حکم بدستور برقرار رہتا ہے۔ چنانچہ اگر اس حالت میں کسی نے کلمۂ کفر کہنے سے انکار کیا اور نتیجے میں اسے قتل کیا گیا تو وہ خودکشی کا مرتکب نہیں، بلکہ شہید قرار پائے گا اور بہترین اجر کا مستحق ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں امور میں فرق کی وجہ کیا ہے؟ ذرا تامل سے فرق خود بخود معلوم ہو جاتا ہے۔ فرق کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ پہلی صورت میں شریعت نے جان بچانے کو ترجیح دی ہے اور دوسری صورت میں ایمان بچانے کو۔ بہ الفاظِ دیگر، پہلی صورت میں اگر جان مقدم ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ جان کی اپنی کوئی خاص ویلیو ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس حالت میں شریعت نے اسے یہ مقام عطا کیا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری صورت میں جب شریعت نے اسے یہ مقام عطا نہیں کیا، تو جان بچانا اہم نہیں رہا، دین کے لیے قربانی دینا اہم ہوا کیونکہ شریعت نے ایسا کہا ہے۔ پس پہلی بات یہ ہوئی کہ جان بچانا فرض ہے اس حالت میں جس میں شریعت نے اسے

بچانے کا حکم دیا ہے اور جہاں شریعت نے اس پر کسی اور امر کو فوقیت دی ہے تو وہاں وہ امر جان سے زیادہ مقدس اور ضروری قرار پاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی حالات میں ، فرد کی مخصوص صلاحیتوں اور مجبوریوں کے پیشِ نظر، ہوسکتا ہے کہ کسی خاص جزیئے میں جان بچانا زیادہ اہم قرار پائے ، یا کم از کم اس کی رخصت ملے ، (دونوں کی مثالیں ابھی ہم نے ذکر کی ہیں) ، لیکن مجموعی لحاظ سے شریعت کے نظام میں دین کو جان پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہمارے نام نہاد" مقاصدی فکر" کے علم بردار بالعموم بحث میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جنھیں مقاصد خمسہ کہا جاتا ہے دین، جان ، عزت ، عقل اور مال کی حفاظت ان میں ترتیب یہی ہے: پہلے دین ، پھر جان ، پھر عزت ، پھر عقل اور پھر مال ۔ انھیں ضروراتِ خمسہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ شریعت کے بنیادی مقاصد ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے درجے کے مقاصد بھی ہیں اور تیسرے درجے کے بھی اور ان میں ہر درجے کے تکمیلی مدارج بھی ہیں ۔ عصرِ حاضر میں ایک نیا رجحان یہ سامنے آیا ہے کہ" مقاصد صرف پانچ نہیں ہیں ، بلکہ فلاں فلاں بھی شریعت کے مقاصد ہیں ۔" بھائی ، کس نے کہا ہے کہ مقاصد صرف پانچ ہیں؟ یا فلاں فلاں شریعت کے مقاصد نہیں ہیں؟ سوال صرف یہ ہے کہ فلاں فلاں کی جو لمبی فہرست آپ دے رہے ہیں ، شریعت کے احکام اور اصولوں کی روشنی میں ان کا مرتبہ اور مقام کیا ہے، ترجیحات میں اس کی باری کب آتی ہے؟ اس لحاظ سے فقہاے کرام نے پہلے تمام مقاصد کو تین بڑے مدارج میں اور پھر ان کے ذیلی مراتب میں تقسیم کیا۔ اگر آپ مقاصد کو پانچ سے پندرہ کر رہے ہیں تو پھر آپ کو ان پندرہ میں بھی ترتیب بتانی ہوگی ۔ کر لیں شوق پورا، اگر کر سکتے ہیں !

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ "شریعت کے مزاج"، "شریعت کی روح" اور "شریعت کے مقاصد" کی رو سے دین کو جان پر فوقیت حاصل ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ فلاں فلاں جزیئے میں تو جان کو دین پر فوقیت دی گئی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے برعکس فلاں فلاں جزیئے میں دین کو جان پر فوقیت بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ اگر وہ کہے کہ دین کی فوقت کی بات ہر جگہ صحیح نہیں ہے تو جواب میں کہا جائے کہ جان کی فوقیت کی بات بھی ہر جگہ درست نہیں ہے۔ ہر جگہ کے لیے اپنا خاص حکم ہی ہوگا۔ ہاں، عمومی مزاج کا پوچھ رہے ہیں تو شریعت کا عمومی مزاج یہی ہے کہ دین کو جان پر فوقیت حاصل ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ

''اللہ تعالیٰ نے جنت کی قیمت پر مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں''۔

پھر اس پہلو پر بھی غور کریں کہ جان بچانا کیوں شریعت کا مقصود ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ جان بچائی جائے تاکہ وہ جان اللہ کی عبادت کرے: وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ۔ (میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی کریں۔) جان بچانے کے اس تصور میں اور مغربی تصور میں، جہاں جان اس لیے بچائی جاتی ہے کہ عالم دوبارہ نیست، زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اس ساری بحث سے یہ معلوم ہوا کہ باجماعت نماز اور جمعہ کی اقامت مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے اور ان کے حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ ان کی

اقامت کا اہتمام کریں اور اس مقصد کے لیے سہولت پیدا کریں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عمومی انداز میں پورے ملک میں باجماعت نماز یا جمعہ کے اجتماع کو نہیں روکا جاسکتا خواہ خطرے کو کتنا ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ باجماعت نماز اور جمعہ جیسے دینی شعائر کی اسلامی شریعت کے نظام میں یہ اہمیت کیوں ہے؟ اس بحث نے اسے واضح کردیا ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے اس بات پر غور کریں کہ سپریم کورٹ نے کہہ دیا ہے کہ کچھ بھی ہوجائے، عدالت بند نہیں ہوگی۔ ریاست کے لیے عدالت کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ عدل نہ ہوتو ریاست رہزنوں اور ڈاکوؤں کے جتھے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ذرا سوچیے کہ باجماعت نماز اور جمعے کی اقامت پورے ملک میں بند ہوجائے، تو شریعت کی رو سے اس ملک، اس قوم اور اس معاشرے کا حکم کیا ہوگا؟

البتہ اگر مجبوری کے عالم میں، جیسے کہیں وبا آئی ہو، یا وبا کے پھیلنے کا قوی اندیشہ ہو، تو کسی خاص علاقے میں، کسی خاص گروہ کی حد تک، عارضی طور پر، جمعہ کے اجتماع کو روکنے کی نوبت آئے تو کیا حکمران ایسا کرسکتا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں "ماہرین کی آرا" پر بحث ضروری ہوجاتی ہے۔

وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ اس ساری بحث میں اب تک ماہرین کی آرا کا ذکر نہیں آیا، انھیں خبر ہو کہ ماہرین کی آرا کا ذکر یہاں تک غیر ضروری تھا۔ جن لوگوں نے ماہرین کی آرا کو ہی بنیاد بنا کر بحث کی بنیادیں اٹھائی ہیں، انھوں نے with all due respect شریعت کے نظام اور اصولوں کی ترتیب کو نظرانداز کیا ہے۔ "ماہرین" کی رائے تیسرا سوال ہے، نہ کہ پہلا!

تیسرا سوال:

کیا "ماہرین" کی آرا کی بنیاد پر وبا کے پھیلاو کے خدشے کے پیشِ نظر

باجماعت نماز یا جمعے کی اقامت پر پابندی لگائی جاسکتی ہے؟

چنانچہ اس ضمن میں اہم ترین اصول یہ ہے کہ "ماہرین" کا کام صرف یہ بتانا ہے کہ ان کے مخصوص علم کی رو سے ایسے کسی خطرے کا امکان کتنا ہے اور وہ امکان کیسے بڑھ سکتا یا کم ہوسکتا ہے؟ اس کے بعد یہ کام شریعت کے ماہرین، یعنی فقہاے کرام، کا ہوتا ہے کہ وہ یہ متعین کریں کہ کیا ماہرین کی اس راے کی روشنی میں شریعت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی شرعی حکم کی اصلی صورت کی جگہ اس کی متبادل صورت لانے کا مرحلہ آگیا ہے، یا شریعت کے اصولوں کی روشنی میں اس کی عارضی معطلی کی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ "ماہرین" اپنی راے کو فقہاے کرام پر مسلط نہ کریں اور فقہائے کرام اپنا فیصلہ کرتے ہوئے شریعت کے اصولوں کو دیکھیں اور" ماہرین" کی رائے سے غیر ضروری متاثر نہ ہوں۔

یہ اصول سیکولر قانون نے اپنے جج کے لیے بھی مانا ہے۔ ڈی این اے کی رپورٹ ہو، آڈیو وڈیو ریکارڈنگ ہو، یا کوئی اور فارنسک رپورٹ، اس کی حیثیت اپنی کچھ نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت کا تعین جج قانون کے اصولوں کی روشنی میں ہی کرتا ہے۔

چنانچہ ایسی صورت میں فتوی کے لیے مفتی کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ "ماہرین" کی اس رائے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خدشہ "محض وہم" کی حیثیت رکھتا ہے، "شک" کی، "ظن" کی، "ظن غالب" کی یا "یقین" کی۔ اور اس میں ہر مرحلے کا اپنا الگ حکم ہے۔ جب تک یہ خدشہ وہم اور شک کے مرحلے میں ہے، ان کی وجہ سے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ جب یہ ظن، یا ظن غالب تک پہنچ جائے تو پھر حکم میں تغیر ہوسکتا ہے۔

حکم میں تغیر، جیسا کہ شروع میں تفصیل سے بتایا گیا، بنیادی طور پر فرد کے لیے ہوتا ہے۔ کس فرد سے باجماعت نماز کی ذمہ داری اٹھ گئی ہے؟ کس فرد

پر جمعے میں شرکت کا فریضہ عائد نہیں ہوتا؟ یا کس شخص کو ایسے اجتماع میں آنے سے روکا جا سکتا ہے؟

کسی خاص علاقے یا خاص گروہ پر بھی ان اصولوں کی روشنی میں عارضی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ تاہم وہ پابندی صرف اسی خاص گروہ یا خاص علاقے کے لیے اور عارضی نوعیت کی ہوگی۔ دیگر علاقوں اور لوگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔ ہر ہر جگہ کے لیے، اور ہر ہر گروہ کے لیے، اسی طرح الگ الگ تعین کرنا لازم ہوگا کہ وہاں اس خدشے کی حیثیت وہم کی ہے، شک کی ہے، ظن کی ہے، ظن غالب کی ہے یا یقین کی؟ عمومی حکم جاری نہیں کیا جا سکتا۔

پھر، جیسا کہ تفصیل سے واضح کیا گیا، جہاں بھی ایسی عارضی پابندی مجبوری کی وجہ سے لگانی پڑے، وہاں اس کے متبادل یا قائم مقام کی صورت دینی لازم ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو وہ حکم کسی نہ کسی صورت میں رائج رہے، چاہے اس کی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ اس پر عمل ممکن نہ ہو۔ چنانچہ جن علمائے کرام نے مثال کے طور پر قرار دیا ہے کہ صفوں میں فاصلہ ہو، ان کی بات بالکل درست ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ہمیں کہا جاتا ہے کہ سپر مارکیٹ میں (یہاں تک کہ "تہذیب بیکری" میں بھی) اتنے سے زیادہ افراد ایک وقت میں داخل نہ ہوں، وہ ایک دوسرے سے اتنا فاصلہ رکھیں، وہ ماسک لگائیں، سینیٹائزر یا ہینڈ واش استعمال کریں، وغیرہ اور یوں کنزیومرزم کے مذہب پر عمل بھی ہوتا رہے اور کورونا سے بچاؤ کی تدبیر بھی ہوتی رہے۔ مسلمانوں کے حکمران کی ذمہ داری ہے، اور یہ ریاستِ پاکستان کے دستور کی رو سے یہاں کی حکومت پر بھی لازم ہے، کہ وہ مسلمانوں کو باجماعت نماز اور جمعے جیسے بنیادی ترین دینی شعائر اور فریضوں کی ادائیگی میں ہر ممکن سہولت دے، نہ کہ ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالے، یا ان پر عمومی پابندی عائد کرے۔

مسلمانوں پر انفرادی طور پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی دینی ذمہ داری کے لیے بھرپور حساسیت کا مظاہرہ کریں اور اس طرح کی عمومی پابندی کے خلاف آواز اٹھائیں۔

ہاں، جو افراد شریعت کے ان اصولوں کی روشنی میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کے لیے ایسے اجتماعات میں شرکت سے گریز ضروری ہے، جیسے بہت زیادہ بڑی عمر کے افراد، وہ اپنے طور پر ان اجتماعات میں شریک نہ ہوں لیکن ظہر کی نماز کا فریضہ بھی ادا کریں اور تلاوت، استغفار اور دیگر اذکار بھی کثرت سے کریں۔

اسی طرح مسلمانوں پر فرداً فرداً یہ احتیاط ضروری ہے کہ ایسے اجتماعات میں شرکت کرتے ہوئے وہ دوسروں کے لیے اذیت کا باعث نہ بنے۔ چنانچہ وہ مثلاً ہاتھ ملانے سے گریز کریں، ماسک لگائیں، وغیرہ۔

ائمہ حضرات کے لیے ضروری ہے کہ خطبہ مختصر رکھیں اور نماز بھی مختصر کریں تاکہ فریضہ بھی ادا ہو اور احتیاط پر بھی عمل ہو۔

جن علاقوں کو قرنطینہ کردیا گیا ہے، وہاں بھی کم سے کم تین افراد پر مشتمل جماعت مختصراً ہی سہی جمعے کی اقامت ضرور کرے۔ (وضو اور تیمم کی مثال پھر یاد کرلیں۔)

هذا ما عندي، و العلم عند الله۔

اللهم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعه، و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابه۔